36

محمدی لوا

میرزا فہیم چغتائی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC NO 017727
MAILSI

TECHNICAL SUPPORT BY
PUBLIC LIBRARY

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (ضلع وہاڑی)
نمبر شمار : .....
کتاب نمبر : .....

بچے بچیوں کیلئے

فہیم! اک ہوش والے کو سبق ہے
یہ میری آپ بیتی کا ورق ہے

محمدی بُوا

مصنفہ

جناب میرزا فہیم بیگ صاحب فہیم چغتائی

ہندوستانی کتبخانہ اردو بازار جامع مسجد دہلی

قیمت ۸ر

دوسری بار — تعداد (۱۰۰۰)

891-437
93

معنونیت

کتاب "محمدی بُوا" اپنے منجھلے چچا میاں (خان بہادر)
جناب میرزا قسم بیگ صاحب چغتائی بی۔ اے علیگ
(ڈپٹی کلکٹر) کے نامِ نامی پر معنون کرتا ہوں ٭

ان چچا میاں نے تیس دسمبر ۱۹۳۶ء والی جمعرات
کو دِن ڈھلے ہم سے منہ موڑ کر اُس عالم کا رخ کیا، جہاں
ایک روز ہمیں بھی جانا ہے۔

لہٰذا ؎

بھروسہ کیا کیا جائے فنا کے کارخانے کا
غنیمت ہی رہے کچھ روز چرچا اس فسانے کا

(میرزا فہیم چغتائی)

مورخہ ۱۵ / مارچ ۱۹۳۷ء

پہلی بات

ہے کوئی سات سال پہلے کا ذکر، جب میرا ایک مضمون "محمدی بوا" لاہور کے رسالے "دلچسپ" میں نکلا، لوگوں نے اُسے بہت پسند کیا، چند دوستوں کی رائے ہوئی، کہ بھئی اسکی کتاب چھپ جائے تو اچھا ہے، بچے پڑھ پڑھ کر خوش ہونگے۔

کچھ دن تو میں سُنی اور اَن سُنی کرتا رہا، پھر جو مولنا عبداللہ صاحب قریشی بی۔اے نے زیادہ زور ڈالا تو چھوٹے چھوٹے باب قائم کرکے وہ مضمون اُن کے حوالے کر دیا۔

کتاب تیار ہونے پر میں نے اسکے دو نسخے اپنے ابا[1] کی خدمت میں بھی بھیجے کیونکہ شروع میں بالکل بچپن کے حالات ہیں، اسلئے کتنی ہی جگہ کچھ معاملہ غلط سلط سا ہو گیا تھا، ابا نے وہ باتیں دُرست کر دیں، اور لکھا کہ بیٹا! یہاں تو بھول گیا، پھر کبھی چھپنے کا موقعہ آئے تو ذرا اس طرح کر دیجیو!

اب میں نے اپنے قبلہ و کعبہ کی تحریر کے مطابق مضمون ٹھیک کر دیا ہے، امید کرتا ہوں کوئی غلطی نہ رہی ہوگی۔

میرزا فہیم بیگ۔ فہیم چغتائی۔

[1] جناب قبلہ مرزا ابراہیم بیگ صاحب چغتائی۔ المتخلص بہ میرزا

فہرست مضامین

صفحہ

(۱) ابا کی پریشانیاں ۵
(۲) آگرہ فورٹ ۸
(۳) ریل کا سفر ۹
(۴) یکّے کی سواری ۱۱
(۵) کچّا راستہ ۱۳
(۶) پردیس کی رات ۱۸
(۷) پہلا دن ۲۱
(۸) محمدی بوا کی یاد ۲۶
(۹) مدرسے میں قیام ۳۲
(۱۰) جورا علا پور کا تبادلہ ۳۶
(۱۱) یہ محمدی بوا ہیں ۴۱
(۱۲) بوا کا برتاؤ ۴۵
(۱۳) بہن اور محمدی بوا ۴۸
(۱۴) رکھ رکھاؤ ۵۰
(۱۵) تباہی ۵۲
(۱۶) بُوا کا دروازہ ۵۴
(۱۷) آخری دیدار ۵۷

محمدی بوا

ابا کی پریشانیاں

میری بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں، اے بیٹا! جب تو پیدا ہوا ہے تو تیرے ابا جنک گنج اسکول لشکر گوالیار میں پڑھایا کرتے تھے وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب کا وطن تھا۔ آگرہ، جہاں ہمارا کنبہ پھیلا ہوا ہے، شہر کے ہندو مسلمانوں سے بھائی بندی کے بیوہار چلے آتے ہیں۔

وطن کی محبت، پیڑھیوں کے برتاؤ، آپس کی دوستی ایک جگہ نوکری چاکری، ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا، تیرے ابا اور ہیڈ ماسٹر صاحب میں بڑا سلوک تھا، ایک جان دو قالب سگے بھائیوں کی طرح میل ملاپ سے رہتے تھے۔

ہرج مرج انسان کے دَم سے لگا ہوا ہے، خدا کا کرنا، ایک دفعہ وہ ذرا ماندے ہوئے کچھ ایسے زیادہ بیمار تو تھے نہیں پردہ کیسے کہیں ہیں، ہر حیلے روزی، ہر بہانہ موت، بچاروں کی اِتّی ہی لکھی تھی، چلتے پھرتے دو چار دن میں ہی چٹ پٹ ہو گئے۔

اُنکا مرنا، اور تیرے ابّا کا بُرا حال ہونا، اب سے دور دشمن آپے میں نہ رہے، ہائے جیسے کوئی سودائی دیوانہ، کہیں جی نہ لگے، مدرسہ کاٹنے کو دوڑے، آٹھ آٹھ آنسو روتے پھریں۔ ایسا جی اچاٹ ہوا، ایسا جی اُچاٹ ہوا، وہ تو نوکری پہ خاک ڈال سیدھے آگرہ چلے آئے۔

بال بچے دار آدمی کی مشکل ہی ہے اس وقت تو انھوں نے کچھ آگا دیکھا نہ پیچھا، آنکھیں بند کر استعفیٰ دے الگ ہوئے پھر آئی مصیبت، بے روزگار خدا دشمن کو بھی نہ کرے۔ بیٹھے بیٹھے کنوئیں کھتّے خالی ہو جاتے ہیں۔ خدا بخشے تیرے دادا میاں کے وقت کا جوڑا جتھا تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا، نوکری نگوڑی کی پونجی کتّی، ہائے یوں کہو، ذرا پردہ ڈھکا ہوا تھا، کون سی ہنڈیاں جمع ہو رہی تھیں، جو اَڑے بِھڑے کام آتیں، برابر والوں سے نظر

لہ۔ دلی والے اڑے بھڑے بولتے ہیں۔ فہیم

نیچی نہوتی۔ دو چار دن ذرا فراغت سے نکل جاتے۔

انسان کیا کرے، کیا نہ کرے، بھنگی، بہشتی، روٹی کپڑا، تیج تیوہار آیا گیا، خدا رکھے، سو خرچ لگے ہیں، آمد بند ہوگئی۔ مرد ذات کہاں تک گھر میں بیٹھے، تیرے ابا بڑے پریشان ہوئے، روزگار کی تلاش میں نکلے، ڈانوا ڈول پھرنے لگے، دن کو دن، رات کو رات نہ سمجھے، اِس سے مِل، اُس سے جُل، نہ جانے کتنے دروازے جھانکے۔ سارے شہر کی خاک چھان ماری،

بڑی ڈور دھوپ کے بعد، خدا خدا کر کے دعا قبول ہوئی، فرنگیوں کو اردو فارسی پڑھانے کی منشی گیری ملی، لیکن جیسا چاہیے تھا ویسا ہاتھ نہ کھُلا وُہی تنگی ترشی رہی

جیسے تیسے کچھ دن کاٹے، پھر دانہ پانی نے زور کیا، ہمارے درجے وُہی گوالیار کی سوجھی، عرضی پرزہ کیا، کاغذ کے گھوڑے دوڑ لئے، تقدیر سیدھی تھی، خدا نے سنی، ضلع جھنڈا ریاست گوالیار، میں انگریزی مڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹری خالی تھی، سو وہ تیرے ابا کو مل گئی۔

آگرہ فورٹ

کوئی چار پونے چار سال کی عمر کا بھولا سا خواب یاد ہے
مجھے اُس جگہ لے جایا گیا ہے جسے آگرہ فورٹ اسٹیشن کہتے ہیں،
جس وقت سواری سے اُتارا گیا، تو دیکھتا کیا ہوں کہ واہ وا لو بھئی
ہم تو اس مکان کے پاس آگئے جس کی لال لال دیواریں
اپنے گھر کی چھت سے نظر آیا کرتی تھیں، افوّہ! کتنا بڑا مکان
ہے، آہا۔

وہ مکان درصل اکبر بادشاہ کا لال قلعہ تھا، جو آگرہ فورٹ
اسٹیشن کے سامنے سڑک کے اُس طرف ہے۔
میں کچھ ہکا بکا سا کھڑا تھا، ابا میری انگلی پکڑ کر دوسری طرف
والے مکان میں لے جانے لگے، مارے سوچ کے میرا ایک ایک
پاؤں سو سو من کا ہو رہا تھا، ہولے ہولے چلنے لگا، ابا کو اُس وقت
بڑی جلدی تھی، اُنھوں نے جھم سے مجھے گود میں اٹھا لیا۔
وہاں جو پہنچے، تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، نہ جانے کہاں کہاں
کے لوگ اُس مکان میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، مارے چیخ
پکار کے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، ابا ہم سب کو ایک جگہ

بٹھا کر دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ میں غائب ہو گئے۔

کوئی دم گیا ہوگا، بڑے زور سے کچھ دھڑ دھڑاہٹ سی ہوئی اور زمین سی ہلنے لگی۔ جھٹ پٹ سب نے اپنا اپنا اسباب اٹھانا اور بُری طرح غل مچانا شروع کیا، مارے ڈر کے میرا کلیجہ دھڑکنے لگا، میں لپک کر بی اماں سے لپٹ گیا، اور جلدی سے اُن کے آنچل میں منہ چھپا لیا۔

اتنے میں ابا "اُٹھو۔ اُٹھو" کہتے دوڑے دوڑے آئے، دو آدمی اُن کے ساتھ تھے، اُنھوں نے آتے ہی ہمارا اسباب اُٹھا لیا۔ بی اماں بہن کو گود میں اور ایک ہاتھ میں پٹاری لیکر کھڑی ہو گئیں، ابّا مجھے بغل میں مار لوگوں کو ریلتے پیلتے[1] ریل تک پہنچے، مجھے کھڑکی کے پاس بٹھا اُدھر سے آپ بھی آ بیٹھے۔

ریل کا سفر

آہا! وہاں تو عجب سیر تھی، خوانچے والے ہی خوانچے والے چیختے پھرتے تھے، کوئی جلیبی کچوری گرما گرم پکار رہا ہے، کہیں "لو جوں چڑیاں بچوں کے کھلونے" کی آواز آ رہی ہے، کسی طرف ڈبل روٹی بسکٹ والا دوڑا چلا جا رہا ہے۔

---

[1] دھکیلتے ہوئے۔

میں کھڑکی کے پاس سے تماشہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، ایک دم انجن نے جو دی سیٹی، ارے! چونک پڑا، ہائیں! یہ کیا ہوا؟

ابھی سنبھلوں ہی سنبھلوں، ہلی جو ریل، دھچ سے بی اماں کی گود میں ابا نے جلدی سے مجھے اُٹھایا، اور کہتے کیا ہیں۔ ہاں! ہاں!! دیکھ وہ رہی جامع مسجد۔ آہا کیوں کیسی اچھی ہے۔ واہ وا۔

اُس طرف جو دیکھا، تو جامع مسجد اور بہت سے مکان ناچتے ہوئے سے نظر آئے، ذرا سی دیر میں جو مُڑا۔ تو ہائیں! نہ وہ مکان ہے، نہ خوانچے والے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہوا میں اڑ رہا ہوں۔

یہاں کچھ اور ہی بہار نظر آئی، زور سے چیخا بی اماں! بی اماں!! ذرا دیکھنا! لو وہ درخت دوڑتے چلے آرہے ہے۔ آہا بکری رہی۔ ارے! وہ گاڑی او ہو گاڑی۔ لو تو وہیں رہ گئی۔ اور وہ درخت کہاں گئے اُفوّہ کتنے کبوتر ہی کبوتر ہیں۔ ابا! ابا!! یہ کیا ....؟

میاں یہ اونٹ ہیں۔

اونٹ! اونٹ!! آہا اونٹ!!! ابا گاڑی ٹھہرا کے ذرا ایک اونٹ کا بچّہ تو پکڑ دو، میرے واسطے، پالوں گا، اور اس کی ماں بھی پکڑ دینا، دودھ پینے کے لئے، بی امّاں اس کی کھیر پکانا!! بہن کو بھی کھلائیں گے، کیوں بی امّاں بہن اونٹ کی کھیر کھائے گی؟

پہلے ہی پہل ریل میں بیٹھ کر میں کیسا کیسا خوش ہوا ہوں، کیا کیا تماشے کئے ہیں، کبھی کھلکھلایا، کبھی کُودنے لگا، کبھی بی امّاں سے لپٹا، کبھی ابّا کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

مجھے کھیلتا کُودتا دیکھ کر میری بی امّاں کا ہاتھوں کلیجہ بڑھ رہا تھا، ابّا کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، مجھے پیار کر کر کے دونوں باغ باغ ہو رہے تھے۔

ایک دفعہ آیا جو مزے میں، بی امّاں کی گود میں سوئی ہوئی بہن کا ننّھا سا پاؤں کھینچ کر چلّایا۔

بہن! بہن!! اری بہن!!! ذرا دیکھ تو وہ عورت ناچ رہی ہے، ارے لو بھینس پانی میں گر پڑی، ہے ہے اب ڈوب جائے گی بچاری۔

یکّے کی سواری!

ریل گاڑی جگہ جگہ ٹھہرتی، بھق بھق دُھواں اُڑاتی شور مچاتی دھڑام سے اٹاوہ اسٹیشن جا دھمکی۔

قلی! قلی!! لڈو، پیڑا، برفی، حلوا گرما گرم، پوری کچوری، ڈبل روٹی بسکٹ، بڑا غل مچا۔ یہاں بھی آگرہ کی طرح، لیجئو دوڑیو، ہونے

لہ۔ مارے خوشی کے ہونٹ کھل رہے تھے۔

لگی، ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔

ابّا نے قلی کو بلا کر اسباب دینا شروع کیا، اُس گڑبڑ میں کہیں بہن کی آنکھ کھل گئی، وہ لگی بلبلانے۔ بی امّاں اُسے ہلورے دیتی۔ برقعہ سنبھالتی گاڑی سے اُتریں۔ ابّا ہم سب کو مسافر خانے میں بٹھا، ہاتھ میں لوٹا لے نہ جانے کہاں چلے گئے۔

بی امّاں نے پوٹلی میں سے کٹوردان نکال کر کھولا، پراٹھے کے ایک ٹکڑے پر تھوڑا سا قیمہ رکھ کر مجھے دیا، اور بہن کو قلاقند کا چورا کھلانے لگیں۔

ابھی دو چار نوالے ہی کھائے ہوں گے۔ ہوا جو اچھو میں نے کُھل کُھل کر کے پانی مانگا، پانی! بی امّاں پانی!!

اُنھوں نے بسم اللہ بسم اللہ کر کے میری پیٹھ تھپتھپائی، کہا صبر کر! تیرے ابّا پانی لینے گئے ہیں۔ لاتے ہوں گے اور لے وہ آ گئے۔

میں نے جو ابّا کو دیکھا۔ گلاس لے کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے دُور سے ہی چمکار کر کہا۔

آہا ہا فہیم ...... پانی پیئے گا۔ اخّاہ! لے میں پانی لایا، اپنے پیارے کے لئے۔ پانی پی اور آ جا میری گود میں۔ نکالا یا ہوں، ،

کیوں بیٹھے گا؟

"گلاس میں پانی ڈال دیا"

میں نے غٹ سے گھونٹ اُتار کر کہا، بیٹھونگا بی اماں! آؤ یکّے میں بیٹھیں۔ (انگلی سے اشارہ کر کے) یہ یکّا ہے۔ آہا ہا اب یکّے میں بیٹھیں گے۔ یکّا آگیا ہے۔ اس کا گھوڑا چلے گا۔

کچّا راستہ

کہاں ریل۔ کہاں یکّا مگر جانور تیز تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی یکّے والے نے شڑاپ سے چابک پھٹکارا۔ اور ٹٹو اُڑا۔ دھڑا دھڑ ہچکولے لگنے شروع ہوئے۔

ہٹو۔ ہٹو! ہٹ جانا۔ بچو بھائی! بچا۔ اپنے ہاتھ کو۔ بابو جی! بابو جی!! بچنا مولوی صاحب۔ بچو!

حلوائیوں کی دوکانیں، خوانچے والے، مزدور، اسکول کے لڑکے، پنہاریاں، پولیس والا، مسجد، پھاٹک، گودام، مندر چونگی، تمام چیزیں ختم ہو کر جنگل آیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگنے لگی درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں، طرح طرح کے پرند۔ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے کھیتوں میں کسان کام کرتے دکھائی

دیتے تھے۔ کہیں گائے بھینسیں چر رہی ہیں، کسی کھیت میں پانی دیا جارہا ہے، ایک جگہ تین چار آدمی کلہاڑوں سے بڑا سا درخت کاٹ رہے ہیں۔

سڑک کے دونوں طرف لہلہاتی کھیتیاں چلی آرہی تھیں، میں پردے سے سر نکالے تماشا دیکھتا جاتا تھا۔

آگے چل کر دُور تک پانی ہی پانی نظر آنے لگا، اور بہت سے پرند ہوا میں منڈلاتے دکھائی دیتے، معلوم ہوا، جمنا آگئی۔ چاندی کی طرح صاف شفّاف ریت کی ایک چادر سی بچھی ہوئی تھی، پانی موجیں مار رہا تھا، بہت سے آدمی نہا رہے تھے، وہاں کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو بھی بالکل ڈر نہ لگتا تھا، خوب مزے سے ڈبکیاں لگا رہے تھے، کنارے کنارے دور تک اونچے اونچے درختوں کی قطار چلی گئی تھی، سامنے دو ایک جھونپڑیاں پڑی ہوئیں تھیں، ان کے قریب اِدھر اُدھر مُرغیاں چُگتی پھرتی تھیں، گھڑونچی کے پاس کبوتروں کی کابک رکھی تھی، ایک کھونٹے سے گائے بندھی ہوئی تھی، اور اُس کا ننھا سا بچّہ کُلیلیں کرتا پھرتا تھا۔

وہاں پہنچ کر ہمارا یکّا ٹھہر گیا۔ سامنے جھونپڑی میں ایک منشی بیٹھا لکھ رہا تھا۔ ابا یکّے سے اُتر کر اُس کے پاس گئے۔ جانے کیا

باتیں کیں۔ پھر ایک کاغذ کا پرزہ لئے ہوئے آئے اور یکے میں بیٹھ گئے۔ ٹخ ٹخ کے ساتھ کوڑے کی پھٹکار سنائی دی۔ ٹٹو چلنے لگا۔

جمنا پر کشتیوں کا پل بندھا ہوا تھا، اس پر گاڑی، چھکڑے آدمی اور مویشی آتے جاتے دکھائی دیئے۔ ہمارا یکہ بھی ادھر کو روانہ ہوا۔

پل کے نیچے بڑے مزے سے جنا اک تار سنسناتی جا رہی تھی، کہیں کہیں ٹوٹے ہوئے تختوں میں سے پانی کی موجیں جھلک رہی تھیں، کشتیوں کو ڈگر ڈگر ہلاتا، اونچے نیچے تختے دھڑ دھڑاتا، ہچکولے کھاتا یکہ تیزی سے چلا میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی، کہ واہ بھئی یہ کیا تماشہ ہے۔

آخر جمنا نکلی، اس پار بھی ویسی ہی جھونپڑی ملی، جیسی پہلے دیکھی تھی، ان سب کو چھوڑ کر آگے بڑھے، تو جنگل شروع ہو گیا، تھوڑی دور تو اکا دکا آدمی دکھائی دیا دو چار بیل گاڑیاں نظر آئیں، اسکے بعد یہاں سے وہاں تک سڑک صاف پڑی تھی ادھر ادھر کریلوں کی کنجوں، چھوٹے بڑے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے سوائے آدمی نہ آدم زاد، کوسوں آبادی کا نام نہیں کبھی میں جھانکتا اور دور دور درختوں کے جھنڈ دیکھ کر پوچھتا،

تو ابا کہتے تھے۔ وہ گاؤں ہیں، وہاں آدمی رہتے ہیں!

چند میل چلے تھے کہ چنبل آگیا، یہ کچھ عجیب دریا ہے، اُس طرف کا اٹک سمجھو، اکثر جگہ اس کی تھاہ نہیں ملتی، اور صاحب! مگرمچھوں کا تو گویا گھر کہنا چاہیے، جدھر دیکھو سوٹھ کی سوٹھ مگر بالو میں لوٹتے نظر آئیں۔

یہاں بھی کشتیوں اور پیپوں کا پُل تھا، ایک پھونس کی جھونپڑی میں منشی جی تشریف رکھتے تھے، ابا یکے سے اُتر کر اُنکے پاس گئے اِدھر یکے والا اپنے تھیلے سے چلم نکال، دوڑا الاؤ کی طرف، جھٹ پٹ آگ رکھ لایا، لگا جلدی جلدی ناریل گڑگڑانے اتنے میں ابا جو واپس آئے، چودھری نے چلم اُلٹی، ناریل واریل تھیلے میں ڈال کوڑا سنبھالا تلے اوپر تین چار ہاتھ مارے۔ ٹٹو تھا کہ چونک کر سیدھا ہو لیا۔

جناب یہ ریل گاڑی نہیں ہے، کہ بستر کر کے دراز ہو گئے، مزے سے سوتے چلے جا رہے ہیں۔ کچا راستہ یکہ تانگے کا سفر قدم قدم پر مصیبت ہے، کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ لو صاحب ایک ندی اور موجود ہو گئی۔

اس کا نام خیر سے "کنواری" تھا، جہاں پُل نہ کشتی، یکے

کے آدھے آدھے پہیے ریت میں دھنسے جائیں، ٹٹو چوکڑی بھول گیا، بچارے کا دم بھول گیا، ہانپ کر یہ بڑی زبان نکال دی، بڑھاتے آگے ہیں، ہٹتا پیچھے ہے، شڑاشڑ کوڑے برسے، ہٹکاری پر ٹٹکاری دی گئی، مگر توبہ! اس نے تو ہمت ہاری سو ہاری، مارے مرے نہ کاٹے کٹے۔

آخر تنگ آکر ابا کود ے، لگے ٹٹو کو دھکیلنے، اتفاقاً ایک آدھ خدا کا بندہ راہ چلتا اور آگیا۔ پھر سب کے سب پہیہ مارتے، چیختے پکارتے ہاتھوں ہاتھ یکا لے چلے۔

آہا اس وقت ریت کی گھسر گھسر نے کیا مزا دیا ہے اس پر یکہ والے چودھری اور دوسروں کی عجیب وغریب آوازیں، آئی شاباش.......ہاں سنبھل کے........اور لگا زور ....آ بیٹا.........ہاں میرا شیر........ہا بہادر......

سن سن کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے،

وہ دن اسی طرح کٹا، ندی، نالے، جنگل بیابان طے کرکے کہیں سورج ڈوبتے ہم ایسی جگہ پہنچے، جہاں کچھ آبادی کے سے آثار نظر آئے، یہاں تک کہ ٹرکتا ٹرکاتا، دونوں وقت ملے ہمارا یکہ ایک کچے مکان کے دروازے پر جا ٹھہرا،

پردیس کی رات

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، کہ شہر کا پختہ مکان چھڑا کر، مجھے ایسے ایسے جنگلوں میں سے گرے پڑے کچے گھر میں لیجایا جا رہا ہے اور ہم اتنی دور آ گئے ہیں، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ آگرہ ہی میں عجب طرح کا خواب سا دیکھ رہا ہوں، پھر سوچتا نہیں، یہ تو کوئی اور ہی بات ہے۔ دیکھ لو بی آماں بیٹھی ہیں، اُن کی گود میں بہن سو رہی ہے، وہ ابا رہے، آگرہ کی تمام چیزیں یاد میں تازہ ہیں۔ آنکھوں سے کچھ اور دیکھ رہا ہوں، نہ جانے یہ کیا ہو رہا ہے اُس گھر کے ٹوٹے پھوٹے دروازے میں پرانی چال کا تالا لٹک رہا تھا، ابا کی آواز آئی۔ افوہ! کنجی تو کہیں گر گرا پڑی اب تالا کیسے کھلے؟

یہاں سے یاد نہیں خدا جانے کیا ہوا، کیا نہ ہوا، میں تو جانوں شاید انھوں نے کسی اینٹ پتھر سے تالا توڑ تاڑ ڈالا ہوگا۔

کواڑ کھول کر ابا نے بلایا:۔

فہیم! فہیم!! ادھر تو آئیو ذرا!!!

جوں ہی میں نے پردہ سے سر نکالا، انہوں نے مجھے

زمین پر اُتار دیا۔

مارے ہچکولوں کے میرا سارا بدن سُن ہو رہا تھا، کھڑے ہوتے ہی جیسے پیروں تلے کی زمین نکل گئی، اور مین تھا، کہ اک دم گر پڑا،

ابا نے جلدی سے ہاتھ کی گٹھری رکھ۔

ارے بھئی! شاباش!! شاباش!!! کچھ نہیں چیونٹی مرگئی، کہہ کر، مجھکو اُٹھالیا،

بی اماں برقعہ اوڑھے، بہن کو لئے یکے سے اُتریں۔ اس کچے کھنڈر کی صورت سے مجھے ڈر سا لگ رہا تھا، میں برقعہ کے دامن سے لپٹتا ہوا بی اماں کے ساتھ ساتھ چلا وہ ویران سُنسان دیہاتی گھر، جس میں جھاڑو بوہارو نہ ہونے کے سبب سے منوں خاک اَٹی ہوئی تھی، جابجا خشک پتّوں کے انبار لگے تھے، ہمارے دم قدم سے آباد ہوا۔

اور لو بھئی! ایک بات تو رہی ہی جاتی ہے، وہ یہ کہ جس وقت اِٹاوہ اسٹیشن کے ہڑبونگ سے میری بہن کی نیند اُچٹی، وہ فوراً ممدی بوا، ممدی بوا، کرکر کے بلکنی شروع ہوئی۔ تار ہی تو باندھ دیا۔ رہ رہ کر بلبلاتی تھی۔ اور ممدی بوا

ممدی بوا کا غل مچاتی تھی۔

بی امّاں اُسے کندھے سے لگاتیں، پیٹھ تھپتھپاتیں، کہیں قلاقند کا چورا کھلاتیں، کبھی پانی پلاتیں، وہ تھی کہ ذرا چپ ہوئی، پھر اک دم ہیاؤں ہیاؤں کرنے لگی،

دن بھر کے سفر، یکّے کے ہچکولوں، اور گھنٹوں رونے دھونے سے ہلکان ہوکر، ذرا کے ذرا اس کی جھپکی[1] لگی تھی، یکّے سے اُترتے اُترتے یکایک چونک پڑی، پھر کیا تھا۔ آفت ڈھادی۔ ممدی بُوا کی دُھوم مچادی۔

اکیلی جان بی امّاں، کیا کریں کیا نہ کریں، ننھی بچّی کو بہلائیں مُنّے[2] کو دیں لیں، چراغ بتّی کریں، سامان وَامان ٹھور ٹھکانے لگائیں، یا اللہ کیا عذاب ہے، جان بھاری ہوگئی، ہاتھ پاؤں پھولے جاتے ہیں، کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا، اِدھر بچّی ہے کہ رَگ[3] پکڑ گئی۔ ہاتھوں سے نکلی پڑتی ہے۔

بہن کا رونا تو کسی طرح بند ہونا تھا نہ ہوا، مجھ پر سفر کا نشہ سوار تھا، گھُمیریوں پر گھمیریاں[3] آرہی تھیں، سر چائیں[4] مائیں کر رہا تھا، میں جو بندھے ہوئے بستر سے ذرا ٹکا وہاں کا وہیں رہ گیا۔

---

[1] سوگئی [2] دھن باندھ دی [3] چکر [4] گھوم رہا تھا

پہلا دن

گہری غفلت میں آواز آئی۔ ابا کہہ رہے ہیں۔
فہیم اٹھے تو ذرا بہلانا! ابھی آتا ہوں!!
ارے! معلوم ہوتا ہے، ابا کہیں چلے باہر، ہیں ہیں مجھے چھوڑے جاتے ہیں، فوراً تڑپ کر اُٹھ بیٹھا، اور آنکھیں کھولنے سے پہلے ابا ابا کرنے لگا۔
اُنھوں نے کہا۔
اہا ہا۔ میرا شیر! اُٹھ بیٹھا۔ شاباش ذرا جلدی سے منہ ہاتھ تو دھولے، ابھی ابھی آتا ہوں، پھر تجھے بازار لے چلوں گا، اچھا!
بس ایک جھلک سی نظر آئی اور وہ دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔
بی اماں نے پچکارا!
اخاہ! میرا چاند، سو اُٹھا، اپنے ابا کے ساتھ بازار جائیگا سیر کرے گا؟ آ تیرا مُنہ دُھلاؤں!!
اب جو دیکھتا ہوں، تو ہائیں! شاید یہ تو وہی گھر ہے

جس میں کل شام کو آئے تھے۔ ارے! یہ کیا ہوا؟ ہم کہاں آگئے، ہمارا مکان تو کچھ اور ہی طرح کا تھا، یہ کس کا گھر ہے؟ اچھا! شاید اب ریل میں بیٹھ کر جائیں گے۔

وہ سماں آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

بی اماں نے مجھے گم سم دیکھ کر گود میں اٹھا لیا، اور چبوترے پر بیٹھ کر لاڈ سے میرا منہ دھلانے لگیں۔

"آکو کوے روٹی۔ میاں کی گردن موٹی"، "چھچی چھچی کوا کھائے، دُودھا بھاتی ننھا کھائے"۔

بہن ابھی تک ننھے سے نہالچے[1] پر پڑی سو رہی تھی، دیوار کے پیچھے سے جگمگ جگمگاتا آفتاب نکلا، اس کی اجلی اُجلی کرنیں نیم کی ڈالیوں میں سے چھن چھن کر انگنائی میں بکھر گئیں۔

وہ یہی آفتاب تھا، جو اب بھی روزانہ نکلا کرتا ہے، اب نہ جانے کیا ہو گیا، جب تو اس کی نورانی صورت مجھے بڑی پیاری پیاری لگتی تھی، جی چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح پکڑ لوں، اور پانی کے گھڑے میں بند کر کے، اوپر

---

[1] چھوٹا سا گدیلا۔

سے چپنی ڈھانک دوں۔

بی اماں نے مُنہ ہاتھ دُھلا کر مجھے چارپائی پر بٹھا دیا، تولئے سے میرا مُنہ پونچھ رہی تھیں کہ بہن روئی، انھوں نے مجھے چھوڑ اُسے گود میں لے لیا، اور بہلانے لگیں۔

اہا وہ پیڑ پہ بگلا بیٹھا ہے۔ جلیبی والا آئے گا۔ ننھی بچی[1] کھائے گی۔

دروازے پہ کھٹکا ہوا، مارے خوشی کے میرا دل اُچھل پڑا کہ آہا! ابا آ گئے، جلدی سے پٹی پر پیٹ ٹکا کر چارپائی سے اُترنے لگا، بی اماں نے بازو پکڑ کر نیچے اُتار دیا۔

دیکھتا کیا ہوں، دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی انگلیاں پکڑے، ابا چلے آرہے ہیں، سامنے آتے ہی کہنے لگے۔

لے فہیم! یہ تیرے ساتھ کھیلنے آئے۔

اُنہیں دیکھ کر بی اماں بھی بڑی خوش ہوئیں، کہنے لگیں۔

اچھا کیا اِنھیں لے آئے، ان بچوں میں اس کا جی بہل جائے گا۔

---

[1] چینی، مٹھائی وغیرہ [2] چارپائی کی لمبائی والی لکڑیاں ۱۲

آؤ بچو آؤ! تمھیں چیز دوں۔ اے ہاں اور ان کے نام کیا ہیں؟

ابا نے چھوٹے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس کا نام عبدالصمد ہے، اور یہ اس کا بڑا بھائی عبدالرحمن!

بچہ بچوں کو دیکھ کر کیسا خوش ہوتا ہے، بہتیری روک ٹوک کرو، دوڑا چھوٹا انہی میں پہنچتا ہے، میں بی اماں کا لاڈلا، دُنیا جہان سے نرالا بچہ، ان کی دیہاتی صورتیں دیکھکر اُلٹا اپنی بی اماں سے لپٹنے لگا۔

اِدھر وہ بھی پرایا گھر سمجھ کے جھجکے، موٹا جھوٹا گزی گاڑھا پہننے والوں کے بچے، بی اماں کا غرارہ دار پائجامہ گوٹہ ٹھپا ٹنکا ہوا رنگ برنگا جوڑا[1] دیکھ کر ڈرے، وہیں کے وہیں کھڑے کھڑے بَل کھانے لگے۔

اکثر بی بیاں بچوں کی کل جانتی ہیں، خاص کر میری بی اماں کو تو بچہ بہلانے کے ہزاروں ہی ڈھب یاد تھے۔ اُن کی گود میں روتا بلبلاتا بچہ کھیلنے کھلکھلانے لگتا تھا۔ جب دیکھا کہ یہ نگوڑے تو مارے ڈر کے سہمے جاتے ہیں تو آپ نے کیا

---

[1] ڈھیلا ڈھالا پائجامہ ۱۲ [2] لباس ۱۲

ترکیب کی، جھٹ پٹ صندوق کھول، آگرہ کا حلوہ سوہن، دال موٹھ، پیٹھے کی مٹھائی، اور کچھ پکوان جو راستے کے لئے ساتھ لائی تھیں، ایک تام چینی کی رکابی میں نکالا۔ پھر چمکارتی دلاسہ دیتی، آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ۔ ان کے پاس پہنچیں۔ ان کے ننھے ننھے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر کہنے لگیں۔

لو بچو! چیز کھاؤ۔ آؤ! آؤ!! اہا بڑی اچھی چیز ہے۔ آؤ ہاں!

بی اماں انھیں پیار کرتی تھیں، اور وہ شرما شرما کر دُہرے ہوئے جاتے تھے، آخر محبت شفقت سے بہلا پھسلا کر ہولے ہولے چارپائی تک لے ہی تو آئیں، اور کہا۔

آؤ بیٹھو یہ تمہارا بھائی ہے، ننھا سا، وہ مارے ادب کے چارپائی پر نہ بیٹھے، زمین پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا، دیہاتیوں کی طرح تمیز سے اس پر بیٹھ گئے، بی اماں نے ان کے آگے رکابی رکھدی۔

واہ وا! کیا بھولے بھالے اور کیسے شرمیلے بچے تھے بدتمیزوں کی طرح تلے اوپر نوالے پر نوالہ نہیں مارنے لگے،

بیچارے سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے
ذرا ٹھہر کر بی آماں نے چمکارا اور کہا۔
بچو! کیا دیکھ رہے ہو کھاؤ۔ مکھیاں بھنک رہی ہیں، کھاتے کیوں نہیں؟ شرمانے کی کیا بات ہے، واہ وا۔ کھاؤ۔ پھر مجھے بھی ان کے ساتھ بٹھا دیا، اور منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں۔

پل مارنے کی دیر تھی، ہم تینوں بچے آپس میں گھل مل گئے اور خوب انگنائی میں کودنے لگے۔

محمدی بُوا کی یاد

شہر کے رہنے والے، کبھی دہلیز سے قدم نہ نکالا تھا، پہلے ہی پہل ہمیں بھنڈ کے چھپروں والے گھر سے بڑی وحشت ہوئی۔ طرّہ یہ کہ وہ گھر تھا بھی خدا کے پچھواڑے[1]، بستی سے دور، قصبہ کے اُس سرے پر، پاس پڑوس، محلّے ٹولے میں کسی پڑھے لکھے بھلے مانس کا گھر بھی نہ تھا، کہ کچھ سہارا ہوتا، اڑوسنوں پڑوسنوں سے

---

[1] بہت دُور۔

بی اماں منہ بولا ناتا جوڑ لیتیں، بہیلی سہیلی بنا لیتیں، ذرا وقت کٹ جایا کرتا، وہاں تو وہی انوریاں گنواریاں کولنیں، کاچھنیں بسی ہوئی تھیں۔

کبھی کبھار کوئی سِڑ بلی بلّی[1] پڑوسن بھُول[2] بھی پڑی تو بی اماں کے کس کام کی، خدا کی سنوار، منہ جھاڑ سر پہاڑ، کھسوٹا سے بال بکھیرے، خاک میں اٹی، گوبر میں ہاتھ سانے اچھی خاصی بھچل پیری[3] بنی ہوئی، یہ یہ بڑے دانت نکالے سڑلنوں کی طرح لپ جھپ لپ جھپ کرتی لہنگا بھڑکاتی چلی آ رہی ہے جالی کھرپا پٹک زمین پر بھسکڑا مار دیا، اور لگی منہ پھاڑ پھاڑ کراوئے اوئے کرنے، گنواری بولی بولنے، بھلا ایسیوں سے بی اماں کی طبیعت کیا لاگ کھاتی۔

البتہ ایک گھر چھوڑ کر ہمارے پڑوس میں کوئی بنینی رہتی تھی، جسے سب چودھران کہتے تھے، بھری جوانی میں بیچاری کا گھر والا مر گیا تھا، دُکھیا اکیلی رہا کرتی تھی۔

بات دُور جا پڑی، جب میں اتنا سا تھا، اس وقت

---

[1] بے وقوف [2] بھولے سے آ گئی [3] چڑیل۔ بھتنی

کا ذکر ہے، لیکن چودھران کی شفقت عمر بھر نہ بھولوں گا، ہائے! غریب کن کن ارمانوں سے ہم بہن بھائی کو گود میں لیتی تھی، میری بی اماں بڑی وہمی تھیں، نظر گذر کے ڈر سے کیا مجال جو ایک پل ہمیں آنکھ اوجھل ہونے دیں، مگر چودھران کی محبت دیکھو، کمال تھا کہ وہ ہمیں اپنے گھر لیجایا کرتی تھی۔

میری عمر بھر میں وہی ایک ہندو دیوی ہے، کہ اُس نے دیسی ہندوانی ہوکر، جس برادری کے مرد تک گوشت کھانے والے مسلمانوں کے بچّوں کو چھوتے جھجکتے ہیں معصوم سمجھ کر ہمیں پیار کیا، ہمارا مُنہ ہاتھ دُھلا دُھلا کر، لوگوں سے چھپا چوری اپنے کانسی پیتل کے برتنوں میں ہمیں لڈو پیڑے کھلائے، ہماری رال اور ناک اپنے آنچل[1] سے پونچھی۔

اسی طرح اُس گھر کے قریب ایک جگہ فوج رہتی تھی، اُس میں ایک صاحب خورجہ والے مُلّاجی مشہور تھے، شکار وِکار کے سلسلہ میں ابّا کی اُن کی دوستی ہوگئی، جب دیکھو ہاتھ پر شکرا[2] بٹھائے چلے آرہے ہیں، وہ بھی مجھے خوب کھلایا کرتے تھے، مجھ کو ہنسانے کے لئے عجیب عجیب آوازیں بناتے، گردن

---

[1] دوپٹہ کا پلّو۔ یا پلّا [2] ایک شکاری پرند۔

اور کندھے پر بٹھا کر دوڑیں لگاتے، بازو پکڑ پکڑ کر جھلاتے میں ان کی ڈاڑھی مونچھیں کھینچا کرتا تھا، اور وہ کچھ نہ کہتے تھے۔

دوسرے تیسرے دن تھوڑی دیر کے لئے ابّا مجھے مدرسے لے جایا کرتے تھے، یا کبھی بازار گئے تو کچھ دُور گودیں کچھ دُور پانوں پانوں ان کے ساتھ چلا گیا۔

اس طرح میری گھبراہٹ تو آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی، لیکن چھوٹی بہن، جس کا دودھ بڑھے شاید ابھی پورا ایک سال بھی نہ ہوا تھا، ہر وقت محمدی بوا کا ہی رونا رویا کرتی تھی، اس کی رَیں رَیں سے بڑا ناک میں دم تھا۔

یہ محمدی بُوا ایک میواتن بی تھیں، انھوں نے ہم بہن بھائی کو گودیوں کھلایا تھا، جب بھنڈ کی نوکری لگی تو بی امّاں نے انھیں ہزار ہزار سمجھایا، سو سو منّتیں کیں، بُوا بچّی تمھارے لئے ہڑکے گی،[1] ذرا ہمارے ساتھ چلی چلو! لیکن پردیس سمجھ کر، یا نہ جانے کس وجہ سے وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئیں، وہیں رہ گئیں۔

محبّت انسان کی گھٹّی میں پڑی ہوئی ہے۔ کیا

---

[1] یاد میں بیقرار ہوگی۔

بوڑھا کیا بچہ، اس سے کوئی خالی نہیں، میری چھوٹی بہن محمدی بُوا سے بے حد ہلی ہوئی تھی، اُس کا ننھا سا دل، ہر وقت ان کی گود میں جانے کو پھڑکتا تھا، ذرا ذرا دیر بعد وہ محمدی بُوا محمدی بُوا کرتی تھی اور بلبلاتی تھی، بلکتے بلکتے بیچاری کا بُرا حال ہو جاتا تھا، وہ محبت کی ماری گھبرا گھبرا کر کبھی ابا کے پاس کبھی بی اماں کی گود میں جاتی، اور محمدی بوا کی بُو باس نہ پاکر پچھاڑیں کھاتیں نڈھال ہو کر ذرا چُپ ہوتی، پھر تڑپنے لگتی ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پھینکتی، کہ ہائے کسی طرح محمدی بوا گود میں لے لیں، بہتیرا محمدی بوا کا غل مچاتی تھی، وہ کس طرح سنتیں وہ تو کالے کوسوں دُور آگرہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

امیر غریب پاؤں پھیلائے میٹھی نیند سوتے تھے، سناٹی رات کے سناٹے میں، بہن سوتے سوتے چونک چونک کر محمدی بُوا کو بلاتی تھی، بُوا بُوا کر کے کان لگاتی، اُن کی آواز نہ سُنکر فریاد کرتی، اور بے قرار ہو ہو کر ایسی روتی ایسی روتی سنبھالنا دوبھر ہو جاتا۔

اُس کی آواز سے میری نیند بھی اُچٹ جاتی تھی، خون کے جوش سے میرا کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا تھا، اس کی مہین مہین

آوازیں میرے دل پر برچھیاں چلاتی تھیں، نہ جانے بی اماں اور ابا کی کیا حالت ہوتی ہوگی، باری باری سارے گھر میں لئے لئے پھرتے، تھپک تھپک کر سُلاتے، وہ ایک نہ سنتی حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّائے چلی جاتی، خبر نہیں محمدی بُوا نے اس پر کیا جادو کر دیا تھا، کہ سگے ماں باپ کی شفقت کچھ بھی اثر نہ کرتی تھی۔

ابا حیران تھے کس طرح اس کے دل میں دل ڈالیں کیونکر سمجھائیں،

ننھی! تیری بُوا نے ہمارا کہنا نہ مانا، بے مروت نے آنکھیں پھیر لیں، اُس کا خیال چھوڑ دے۔

بی اماں نڈھال ہو ہو کر کہتی تھیں۔

اری بچّی! صبر کر خدا تیرے حال پر رحم کرے، ہائے محمدی تجھے کیا کہوں، اس ننھی سی جان پر ترس نہ آیا، اتّی سی کا غذاب لے رہی ہے، اری محمدی! ہائے تو نے کیا کیا، بچّے کا صبر برا ہوتا ہے معصوم کا دل دُکھانا اچھا نہیں، یا اللہ اس کی ہائے سے محمدی کو بچائیو!

ابا کے آنسو نکل نکل پڑتے تھے، بی اماں رو رو دیتی تھیں

اور کچھ زور نہ چلتا تھا، بہن بچھڑے ہوئے غمزدوں کی طرح لگاتار روئے جاتی تھی، خدا جانے بچاری کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔

اس کے رونے سے کبھی کبھی مجھے بھی محمدی بوا کا خیال آجایا کرتا تھا، جب بہت غور کرتا تو کچھ یوں ہی سا دھیان بندھتا، کہ ہاں! بھئی کوئی محمدی بُوا تھیں تو سہی، اور شاید مجھے گود میں بازار بھی لے جایا کرتی تھیں، لیکن ان کی ٹھیک ٹھیک صورت کسی طرح یاد نہ آتی تھی، میں انھیں بھول گیا تھا، پھر کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کہ بہن جو بالکل ذرا سی تھی اسکے دل میں بوا کیسی بیٹھ گئی تھیں کہ وہ ان کے لئے مدتوں تڑپی، اور رو رو کر بی اماں کی آدھی جان کرتی رہی۔

مدرسے میں قیام

اُس مہربان چودھرائن کے پڑوس میں ہمیں زیادہ عرصہ رہنا نصیب نہ ہوا، آئی جو برسات۔ اور پڑا جو موسلا دھار پانی، وہ مٹی کا گھر دندا دھوکا دے گیا، پچھواڑے کی دیوار

اُڑا اُڑا دھوں ہوگئی، گھر بیٹھے گلی کا کمر کمر پانی نظر آنے لگا، پھونس کے پُرانے دُھرانے چھپّر ہم پر لوٹے پڑتے تھے، جدھر دیکھو ٹپ ٹپ ٹپکا لگا ہوا ہے، اولتیوں کی تُلِلیاں، بندھی ہوئی ہیں، یہ یہ لوندے گر رہے ہیں گھر کا گھر اب گرا ہو رہا ہے۔

کالی کالی گھنگھور گھٹائیں دے آدے اُمڈی چلی آتی تھیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے میرا کلیجہ دہلا جاتا تھا، بہن رونا دھونا بھول بی اماں سے چپکی کی چپکی ہی رہ گئی، معلوم ہوتا تھا کہ دنا دن توپیں دغ رہی ہیں، کوئی دم میں آسمان ہمارے سروں پر پھٹ پڑے گا،

ابا نے جو یہ رنگ دیکھا، دوڑے دوڑے گئے، جلدی سے ایک سواری لے آئے، جھٹ پٹ ہمیں بٹھا مدر سے میں جا اُتارا، پھر کچھ ایسی صورت ہوئی کہ ہم وہیں رہ پڑے،

اس بات کے تین ساڑھے تین سال بعد میرا منجھلا بھائی میرزا سلیم بیگ (مرحوم) پیدا ہوا، اب ماشاء اللہ مجھ

میں اچھی خاصی سمجھ آگئی تھی۔ بہن کا رونا بھی مدتوں کا بند ہو چکا تھا، اُسے محمدی بُوا یاد نہ رہی تھیں بی اماں۔ ابا۔ میں اور بہن ہم سب اپنے اپنے حال میں خوش تھے۔

کبھی کبھی چھٹیوں میں آگرہ کا پھیرا بھی ہو جاتا تھا، اس طرح کتنی ہی مرتبہ آنا جانا ہوا، لیکن کبھی محمدی بُوا نہ دکھائی دیں شاید ہمارے بھنڈ جانے سے ان کا دل وہاں نہ لگا، اور وہ گھر اکر اپنے گھر لشکر گوالیار چلی گئیں۔

آگرہ جاتے بڑی خوشی ہوتی، جوں ہی ابا کی چھٹی پوری ہونے لگتی، رشتے کنبے والوں سے مل جُل کر ہم سب بھنڈ چلے آتے واپس آکر کئی دن تک مجھے آگرہ کے خواب دکھائی دیا کرتے تھے، معلوم ہوتا آگرہ والے مکان کے دروازے پر چیز والا بول رہا ہے اور میں "جلیبی والے جلیبی والے" کر کر کے بُلا رہا ہوں، کبھی ریل کی دھڑ دھڑاہٹ کانوں میں آتی، کہیں انجن کی سیٹی سنائی دیتی، کبھی کشتیوں کے پل دکھائی دینے لگتے، ذرا میں معلوم ہوتا یکّے سے اُتر کر دریا میں نہانے

والے بچّوں کی طرف جا رہا ہوں، اتنے میں بی امّاں ہائیں! ہائیں!! کرتی دوڑیں۔

ارے فہیم! کہاں چلا۔ ہے ہے ڈوب جائیگا!!

مُڑتے مُڑتے انھوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا، پھر خیال ہوتا، ہرنوں کے پیچھے دوڑتا پھر رہا ہوں، فوراً ہی جنبل کی ریتی میں مگرمچھ لوٹتے دکھائی دینے لگتے۔

اسی طرح جب آگرہ جاتے، تو بھنڈ کا مدرسہ گلی کوچے، ہاٹ، بازار سوتے جاگتے میری آنکھوں میں پھرا کرتے، وہاں کی چیزیں میرے دل پر ایسی نقش ہو گئی تھیں کہ اُن میں سے بہت سی ابھی تک جوں کی توں موجود ہیں، جب خیال کرتا ہوں اپنا بچپن یاد آجاتا ہے، بھنڈ میں چلتا پھرتا۔ پُھندنا سا پُھدکتا نظر آنے لگتا ہوں، اور کیسا کیسا جی چاہتا ہے کہ خدا کرے پھر وہی وقت آجائے۔

گوری تال، گنج، قلعہ، نوادے، کا میلہ، راجہ بھدا ور کے محلّات، اور وہ چھولیانہ[1]، جہاں ہرنوں اور خرگوشوں کا

---

[1] ڈھاک کے درختوں کا جنگل۔

شکار کھیلا جاتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہیں، یہاں تک کہ ساتھ کھیلنے والے لڑکے لڑکیوں میں سے کتنوں ہی کی شکلیں اور نام ابھی تک نہیں بھولا ہوں، اگر خدا کی قدرت سے اِس وقت وہ ویسی ہی صورت کے ہو کر میرے سامنے آجائیں، جیسے کہ بچپن میں تھے تو انشاء اللہ فوراً پہچان لوں، اور اُسی طرح نام لے لے کر بُلاؤں۔

جوراعلاپور کا تبادلہ

اندازاً کوئی چھ سال تک ہم لوگ بھنڈ میں رہے، جب میرا دل وہاں لگ گیا، لوگوں سے اپنایت ہوگئی، اور میں بھنڈ کو ایک طرح کا اپنا وطن سمجھنے لگا، تو افسوس! جوراعلاپور کو ابّا کا تبادلہ ہوگیا، جب معلوم ہوا کہ اب ہم جوراعلاپور جانے والے ہیں، تو مجھے طرح طرح کے خیالات بندھنے لگے، بھنڈ چھوڑتے میرا جی دُکھتا تھا، کہ نہ جانے وہاں کے لوگ کیسے ہونگے، چلتے وقت رہ رہ کر خیال آتا تھا، کہ ہائے

اب ہم جاتے ہیں، ہمارا بنا بنایا گھر بگڑ رہا ہے، یا اللہ یہیں رہتے تو اچھا ہوتا۔

نوکری کا معاملہ، پرائی تابعداری ٹھہری، ابا بھی کیا کرتے، مجبور تھے بھنڈ چھوڑے بغیر کیسے کام چلتا۔

اُس وقت یہ گوالیار لائٹ ریلوے کہاں نکلی تھی، بیل گاڑیاں چلتی تھیں، گوالیار ہو کر راستہ تھا، ایک دن منہ اندھیرے گاڑیاں ہنکین، دھچر، دھچر، دھچر، جنگلوں میں شام سویرے کرتے دو تین روز میں ہم گوالیار پہونچے، یہاں میرے کنبے کی ایک دادی اماں رہتی تھیں، ابا تو ہمیں ان کے گھر چھوڑ کر مکان و دکان کا ٹھیک ٹھکانا کرنے، جورا علاپور[1] چلے گئے، ہم سب دادی اماں کے مہمان رہے۔

یہاں ایک اور مزا آیا، وہ یہ کہ لشکر میں میری چھوٹی خالہ بھی رہتی تھیں، ان کے ساتھ خدا بخشے منجھلی خالا لہ بی کا بڑا بچہ سید احتشام علی مرحوم بھی تھا، گوالیار میں خالا بی کو جو مہمان بلایا گیا

---

[1] گوالیار سے ڈھائی تین میل فاصلہ پر ریاست گوالیار کی راجدھانی ۱۲

تو احتشام بھی اُن کے ساتھ آیا، آہا وہ ایسا اچھا گورا گورا نرم نرم روئی کا سا گالا بہن کی عمر کا تھا، ہم بہن بھائی اُسے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے، اور اُسے بھی جب معلوم ہوا کہ ہم اس کی خالہ اماں کے بچّے ہیں، تو وہ ذرا سی دیر میں ہمارا بڑا دوست ہو گیا، خالہ بی کے پاس بچارا اکیلا گھبرایا کرتا تھا، یہاں جو وہ بہن بھائی کھیلنے کو ملے، بڑا خوش ہوا، اب بھلا وہ خالہ بی کیطرف کیوں جانے لگا۔

ادھر بی اماں کو بھی موئی مٹی کی نشانی اُس معصوم پر بڑا ترس آیا، اور اُسے اپنے پاس رکھنے کو ان کا جی چاہا، خالہ بی تو اُسے ہرگز نہ چھوڑنا چاہتی تھیں، لیکن بی اماں کے کہنے سے مجبور ہو گئیں، چنانچہ جب ہم جورا علاپور جانے لگے تو احتشام بھی ہمارے ساتھ گیا۔

یہاں دیکھا تو دنیا ہی دوسری تھی، نہ بھنڈ کی سی رونق، نہ وہاں کے سے آدمی، نہ ویسا پہناوا، نہ اُس طرح کی بول چال، تمام چیزیں کچھ اور ہی طرح کی نظر آئیں۔

خدا کی شان، پہلے پہل گھر یہاں بھی جنگل کنارے ہی ملا، کھڑکیوں سے کھیت ہی کھیت نظر آیا کرتے تھے، چھت سے ڈور ڈور کی سڑکیں دکھائی دیا کرتی تھیں، لیکن ایک تو میں ذرا بڑا ہو گیا تھا، دوسرے عادت پڑ کر وہ وحشت نہ رہی تھی، تیسرے اختشام ساتھ تھا، یہاں کچھ ایسی گھبراہٹ وبراہٹ نہیں ہوئی۔

یہ قصبہ یوں کہنے کو تھا تو ضلع، مگر بھنڈ کے مقابلہ میں بالکل اُجاڑ، کور دیہہ، اتنا ضرور ہے کہ وہاں کے صوبہ صاحب (کلکٹر) جناب رائے بہادر بالمکند بھیا صاحب گوالیاری ایک پُرانی شان کے کایستھ رئیس تھے، اور انھوں نے کسی وقت میرے ابا کو پڑھایا بھی تھا، بڑی مہربانی سے پیش آتے، سبحان اللہ! کیا لوگ تھے، کہ چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسے انسان نہ ملیں کیسے شوقین مزاج، ان کے جلسے نوابی درباروں سے پہلو مارتے تھے، راجہ اندر کی سبھا کا مزا آتا تھا۔

لہ۔ برابری کرتے تھے۔ لہ آپ ابھی تک موجود ہیں۔

صوبہ صاحب کے علاوہ قبلہ مولوی سید عنایت احمد صاحب بدایونی سپرنٹنڈنٹ پولس کے گھرانے سے بھی ہمارا بڑا میل جول ہوگیا، ان کا منجھلا لڑکا سید آل نبی میرا بڑا دوست تھا۔ اکثر ہم میں تلے اوپر کے بھائیوں کی سی لڑائیاں بھی ہوا کرتی تھیں، مگر کیا، ابھی لڑے ابھی ایک

بھنڈ کی طرح یہاں بھی دو مکان بدلے گئے، دوسرے گھر میں چھوٹی خالا بی کو لشکر سے مہمان بُلایا گیا، وہ ماموں باسط علی صاحب کے ہمراہ جورا علاپور آئیں۔

جورا علاپور آئے شاید ایک سال ہوا ہوگا، خالا بی کی موجودگی میں گوالیار کے تبادلے کا حکم آگیا، اُس وقت ہم سب کو کیسی خوشی ہوئی تھی، کہ اچھا ہوا، اب ہم اپنے گوالیار والے رشتہ داروں میں رہا کرینگے۔

دادی اماں کا گھر موجود ہی تھا، ہم سب بہت جلد خوشی خیر سلاّ سے گوالیار چلے آئے۔

یہ محمدی بوا ہیں

پہلے تو چند مہینے ہم اپنی دادی اماں کے پاس ایک گھر میں رہے، اس کے بعد باریوں کی گلی اٹھ گئے، وہاں میرا چھوٹا بھائی میرزا حلیم بیگ سلمہٗ عرف میرزا مغل پیدا ہوا، اب خدا کے فضل سے ہم تین بھائی ایک بہن، اپنے ماں باپ کے چار بچے ہو گئے۔

سال سوا سال وہاں رہ کر ہم مدی کے بازار میں جا رہے، یہ مکان کچھ اس وضع کا تھا کہ نیچے کے حصے میں رہنا مناسب نہ معلوم ہوا، اوپر بہت سی مکانیت تھی، ہم تو چھت پر رہنے لگے، نیچلے حصہ میں بی اماں نے ایک بھینس دو گائیں پال لیں پھر کیا کہنا، گھر میں دودھ دہی کی گنگا جمنا بہنے لگی۔

یوں تو ویسے بھی گوالیار ہمارا وطن ثانی ہے کیونکہ کئی پشت سے ہمارے خاندان کے وہ لوگ جن میں گوالیار والی دادی اماں تھیں، تیر اندازی اور سپہگری میں مہاراجوں کے اُستاد

چلے آتے تھے، دوسرے ہمیں جو رہتے بستے کچھ سال گذرے سارا شہر اپنا ہو گیا۔

ایک روز کا ذکر ہے، میں جو باہر سے آیا کیا دیکھتا ہوں، کوئی بی میری اماں سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہیں، ابھی پورا زینہ طے نہ کرنے پایا تھا، وہ بی خوش ہوتی، صدقے قربان کرتی دیوانوں کی طرح آپے سے باہر مجھ پر ٹوٹ پڑیں، سر سے پاؤں تک بلائیں لے لیں، دعاؤں کی بارش کر دی، اور اُن کا جی نہ بھرا، عجیب تماشا تھا، ایک محبت کی ماری بی چوچلے کر رہی ہیں، اور میں ہکا بکا سا ہو کر اُن کا مُنہ تک رہا ہوں۔

بڑے پیار سے چمکار کر پوچھنے لگیں، واری جاؤں میرے لال تو نے مجھے پہچانا؟

اے لو! کبھی دیکھا نہ بھالا، پہچانوں کیا خاک، کچھ جواب نہ دے سکا، گُپ چُپ سر جُھکا کر رہ گیا۔

اتنے میں بی اماں نے کہا۔

فہیم! یہ محمدی بوا ہیں۔"

اُف! .... اخّاہ .... لو یہ محمدی بُوا ہیں .....

آہا ..... جبھی تو .... اچھا! اب سمجھا یہ وہی محمدی بُوا ہونگی ....

.... ٹھیک ..... واہ وا .... یہ محمدی بوا ہیں۔

مارے خوشی کے میرے آنسو اُبل پڑے، آناً فاناً بھولی بسری باتیں یاد آگئیں، بچپن کے تماشے آنکھوں میں پھرنے لگے۔ پَل مارتے معاملہ ہی کچھ کا کچھ ہوگیا۔

کیا کہوں، محمدی بُوا مجھے کیا نظر آنے لگیں، ماشاءاللہ اچھا خاصا ہوگیا تھا، اُن سے شرمانے کی کیا بات تھی، مگر توبہ صاحب نظر سے نظر نہیں ملتی، بُوا کو دیکھنا دشوار ہوگیا۔

اور صاحب اُنھوں نے بھی تو حد ہی کردی، مجھ تیرہ سالہ ڈھونگ کے ڈھونگ کو تماشہ کرلیا، لگیں بچّوں کی طرح کھلانے معلوم ہوتا تھا، کسی دودھ پیتے کو بہلا رہی ہیں۔

اُن کے آنے سے ہمارا گھر بھرا بھرا سا لگنے لگا، خدا جانے ایک رونق ہوگئی، ویسے تو اُن کی سب کو ہی خوشی تھی، لیکن بہن کا حال تو کچھ پوچھو ہی نہ، پھولی نہ سماتی تھی، کہ آہا محمدی بُوا آگئیں

آپ بڑے سلیقے سے اوڑھنی اوڑھے اُن کے کاموں میں دوڑی دوڑی پھرتی تھیں۔

اُس وقت چھوٹے بھائی میرزا مغل کے کھلانے پر ایک دوسری میواتن بی "چندو بائی" مقرر تھیں، پھر بھی بی اماں کا جی چاہتا تھا، کہ محمدی بُوا بھی رہیں، اس لئے ان سے کہا۔

بُوا! اب کہاں جاؤ گی؟ لے تمہارا کون ہے، یہیں رہو"

نہ جانے اُن کے جی میں کیا آئی، اُنھوں نے جواب دیا:۔

بیوی! شکر ہے۔ اللہ نے ملایا۔ سب آگئے، میرے دن پھرے، نصیبا جاگا، یہ چار قدم تو لشکر ہے ہی، کوئی بات نہیں، یہاں رہی یا وہاں رہی، دل سے دُور نہ ہونا چاہئے جب ذرا جی گھبرایا کرے گا، خدا رکھے اپنے بچّوں کو دیکھ جایا کروں گی۔

بی اماں نے کتنا کتنا کہا، بوا نہ مانیں، جہاں تک یاد ہے شاید چار پانچ روز رہ کر اپنے گھر لشکر چلی گئیں، اس وقت سے دستور بندھا، کبھی چھٹے چھماہے وہ اچانک آجاتیں خیر سے

دو چار روز مہمان داخل رہتیں، پھر ہماری بلائیں لیکر دعائیں دیتی ہوئی چلی جاتیں۔

بوا کا برتاؤ

سنا ہے محمدی بوا، میری پیدائش سے بہت چلے عین جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں پھر راجپوتی آن یا اپنے قومی رواج کے مطابق دوسرا نکاح ہی نہ کیا، جس سے گھر بستا، بچاری کا کوئی بال بچہ بھی نہ تھا، کہ آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہوتا، گھٹتی کے پہرے ڈھارس بندھتی، نہ جانے بچاری کس مصیبت سے روٹی کپڑا چلاتی ہونگی۔

مجھے ناز ہے! اور میرے خاندان کی آئندہ نسلیں فخر کریں، اس بات پر، کہ میری کھلائی محمدی بوا کے پاکیزہ چال چلن کی سب تعریف کرتے تھے، اب ایسی نیک بی بیاں کہاں ملتی ہیں، جیسی کہ خدا بخشے میری بوا تھیں۔

خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے! کہ تونے ایک پارسا بی بی کی

گود میں میری پرورش کرائی !!

کچھ امیری غریبی پر نہیں، اللہ مالک ہے جسے چاہے جس دولت سے مالا مال کر دے، کتنے ہی امیر ایسے کنجوس مکھی چوس ہوتے ہیں جن کے نام پر دُنیا تھُو تھُو کرتی ہے، اور بعضے غریبوں کو خدا نے ایسا دل غنی بنایا ہے، جن کے آگے بڑے بڑے پیسے والوں کی کچھ حقیقت نہیں،

میری محمدی بوا بچاری ہزار غریب سہی، لیکن سبحان اللہ راجپوت بی بیوں کی طرح دل بڑا رکھتی تھیں، جب کبھی ہمیں دیکھنے آتیں، اپنی حیثیت موجب کچھ نہ کچھ سوغات ضرور لاتیں کہیں بڑے بڑے پیوندی بیر لیے چلی آرہی ہیں، کبھی آئیں تو کھیلوں بتاشوں سے ہم بہن بھائیوں کے دامن بھر دیئے، گرمیاں ہوئیں تو لو صاحب دو چار بانس کے پنکھے ہی سہی، اور کچھ نہیں تو خیر کچھ ہری ہری ترکاریاں ہی لیتی آئیں، کبھی چپکے سے ایک آدھ ڈھولی پان لاکر رکھدیئے۔

بی اماں کی بڑی مشکل، کیا کریں کیا نہ کریں، سخت پریشان،

اُن غریب کی چیز لینے کو جی نہیں چاہتا، اور انکار بھی نہیں کر سکتیں، کہ بچاری کا دل نہ دُکھے، تھوڑی[1] تھوڑی ہونے لگتیں۔ منتوں سے کہتیں۔

اے بُوا! بُرا نہ ماننا۔ خدا جانے تم تو بڑا شرمندہ کرتی ہو، عمر بھر یہاں رہو، خیر سے روز آؤ، تمھارا گھر ہے، پر بُوا ایسا بوجھ نہ ڈالا کرو!

بُوا جواب دیتیں۔

بی! قربان گئی۔ اس میں بوجھ کاہے کا، لو بھلا اپنے بچّوں کو خالی ہاتھ دیکھنے کیسے آؤں؟ بدشگونی کی بات ہے؟

پھر بی اماں رُکتے رُکتے کہتیں۔

اچھا بُوا خیر! تمہاری خوشی..... تو اچھا دام لے لیا کرو! پھر تو بدشگونی نہیں ہوگی..... کیوں؟

اُس وقت بُوا ہوں ہاں میں بات ڈال دیتیں، اور پھر جو آتیں، کسی نہ کسی بہانے، اپنا شگون ضرور پورا کر لیتیں۔

---

[1] شرمندہ ۱۲

بہن اور محمدی بُوا

اتنی مُدت میں بہن کو اپنی ناسمجھی کی باتیں یاد نہ رہی تھیں، وہ صورت جو کبھی سوتے جاگتے، اس کے سامنے رہا کرتی تھی کب کی مٹ چکی تھی، جن "محمدی بُوا" کے لئے رو رو کر وہ اپنی پرائی نیند حرام کر دیتی تھی، ایک بھولا ہوا خواب ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اگر بی اماں کبھی اُن کا ذکر بھی کرتیں تو اُسے کچھ خیال نہ ہوتا، کہ آخر! اے ہو نگی کوئی محمدی بُوا۔

اب جو بُوا سامنے آئیں، میں بہن سے بڑا ہو کر اُنہیں نہ پہچان سکا، تو بھلا اُسے کیونکر یاد رہتیں، جس نے اُن کو بالکل ہی ناسمجھی میں دیکھا تھا۔

یہ سب کچھ سہی، لیکن محمدی بُوا تو آخر وہی بوا تھیں نا؟ جنھوں نے ہم بہن بھائی کو گودیوں کھلایا تھا، چھاتی سے لگایا تھا، دل کے گہوارے میں جھلایا تھا، سوکھے میں سُلایا تھا، اُن کی مامتا کہاں جاتی، نظر ملنے کی دیر تھی، پُرانی محبت نے

جوش کھایا، اِس شفقت سے پیش آئیں، ایسی ٹوٹ کر ملیں، بات کرتے بہن پر جادُو کر دیا۔

دِل سے دل کو راہ ہوتی ہے، ذرا سی دیر میں بہن اُن کے لئے پھر ویسی کی ویسی ہوگئی، جیسی بچپن میں تھی۔

ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اب وہ اُن کے واپس جاتے وقت روتی بلبلاتی تو نہ تھی، لیکن کچھ سُست سُست سی ضرور ہو جایا کرتی تھی، اس کا دل کہتا تھا کہ ان بُوا نے مجھے پالا ہے، یہ میری دوسری بی اماں ہیں، اِنھیں کسی نہ کسی طرح اپنے پاس رکھنا چاہئے، مگر بچاری کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ لڑکی ذات کیا کرتی، دم مار کر گم سُم سی رہ جایا کرتی تھی۔

جس وقت بُوا آئیں تماشہ ہوتا، بی اماں بیٹھے سے کھڑی ہو جاتیں، بہن "بُوا آئیں، بُوا آئیں" کرتی دوڑتی، مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی، آپے سے باہر ہو جاتی، ہیں جُھک جُھک کر اُنھیں سلام کرتا، بُوا رہ رہ کر ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتیں، بلائیں لے لے کر ہزار ہزار دعائیں دیتیں، ہمیں

گھر بیٹھے جنت کا مزا آنے لگتا۔

اور جاتے وقت کا حال کیا بتاؤں، معلوم ہوتا گھر کی برکت چلی، بی اماں رُوہانسی سی ہو جاتیں، میرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے، بہن کی صورت دیکھنے سے رونا آتا۔

ایک زمانہ یوں ہی گذرا، محمدی بُوا ہمارے یہاں آتی جاتی رہیں۔

رکھ رکھاؤ

اللہ! اللہ!! وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا، اگلے لوگوں کے قصّے کہانی رہ گئے، آہ! اب ایسے نظارے کس کے نصیبوں میں، جیسے میں دیکھ چکا ہوں، آج تو وہ وقت ہے، کہ کچھ ادب نہ لحاظ، انسانیت کوچ کر گئی، تہذیب کا جنازہ اُٹھ گیا، چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ ہو رہے ہیں۔ بابا مجھے تو بات کرتے ڈر لگتا ہے، کون خدا

لہ رونے کی سی حالت ۱۲

واسطے کی تُو تُو مَیں مَیں کرے، لوگ تو ناحق بھی کسی کے سر ہونے کو پھرتے ہیں۔

یا وہ زمانہ تھا کہ آقا غلام میں برابری کا برتاؤ تھا، بیوی باندی میں تمیز نہ تھی، بہنوں کی طرح سلوک سے رہتی تھیں،

میں نے بی اماں اور محمدی بُوا میں جو رکھ رکھاؤ دیکھا ہے، اس وقت بڑے بڑے افلاطونوں میں نہیں پاتا۔

ایک عزت کرتی تھی، اس نے میرے بچّوں کو پالا ہے، اس کا احسان کسی طرح نہیں اُتر سکتا،

دوسری کا ایمان تھا کہ واری جاؤں یہ میری بی ہیں، اِن کا نمک میری رگ رگ میں بسا ہوا ہے، رونگٹا رونگٹا زبان ہو جائے، جب بھی ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔

بی کی آرزو ہے۔ بس چلے تو اپنی اس خیر خواہ دائی کو سوالاکھ کی ڈھیری پر بٹھاؤں، اس کا مُنہ موتیوں سے بھروں، اسے سونے روپے سے نہلاؤں۔

دائی کی نیّت ہے۔ بی میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں

تو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں۔

سنا! اگلے لوگ ایسے تھے، میں نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں، اُن ہاتھوں میں پلا ہوں۔

تباہی

اِدھر میری زندگی کا سولھواں سال شروع ہوا، مرادوں کے دن لگے۔ اُدھر بی اماں کا آخری وقت آپہنچا، کچھ ایسی گھڑی سے بیمار ہوئیں، دِن دُونی رات چوگنی طبیعت گرتی ہی تو گئی بہتیری دوڑ دھوپ کی، حکیم، ڈاکٹر، سیانے، دوانے دنیا بھر کے جتن کر ڈالے، مرض اُنیس نہ ہوا، یہاں تک کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں، ابا اور ہم چاروں بہن بھائی روتے دھوتے رہ گئے۔

ایک دم کی برکت سے، اپنی حیثیت کے مطابق شہر میں ہماری بات بنی ہوئی تھی، مزے سے زندگی کے دن گذار رہے تھے، بی اماں کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی، اندھیر

ہوگیا، مصیبتوں کا آسمان ٹوٹا، تباہیوں پر تباہیاں شروع ہوئیں۔ بھینس کا کٹڑا مرا، ایک گائے چرواہے نے کہیں غائب کردی، دوسری کو کہتے ہیں کسی زہریلے جانور نے ڈس لیا، طوطے نے پھڑک پھڑک کر جان دے دی، فاکس ٹیریئر نسل کا ایک بڑا خوبصورت کتا جسے میں بہت چاہتا تھا، ایک دن بچارا سوتا کا سوتا ہی رہ گیا۔

چند روز تو پرسے[1] کے مہمانوں سے کچھ نہ کچھ چیخ پکار رہی، اس کے بعد دن دہاڑے ہمارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ جب ہم باپ بیٹے باہر جاتے تو گھر میں بہن کے پاس سوائے چھوٹے چھوٹے بھائیوں اور مرزا حلیم کی کھلائی، چندو بائی کے کوئی نہ رہتا، ہائے! جس وقت گود کا بھائی اماں اماں کرکے بلبلاتا، بہن بچاری بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اور خدا بخشے چندو بائی سے بھی نہ رہا جاتا، بہتیرا جی کڑا کرتیں، کہ بچے ہراساں نہ ہوں، آنسوؤں کا تار بندھ جاتا۔

---

[1] ماتم پرسی۔ تعریف ۱۲

آخر ابا نے چھٹی لی، ہم سب کو لے کر آگرہ گئے، پھر بہن کو منجھلی خالہ بی کے پاس چھوڑ کر گوالیار آئے۔

ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا، در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی کچھ نہ پوچھو اُجڑا گھر دیکھ کر خدا یاد آگیا، کہ ہائے وہ رونق کیا ہوئی جو بی اماں کی زندگی میں تھی۔

بُوا کا دروازہ

کچھ عرصہ بعد ابا کا تبادلہ ضلع بھانڈیر[1] کو ہو گیا، وہ دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لے کر بھانڈیر چلے گئے، میں وکٹوریہ کالج لشکر کے انجینرنگ سیکشن میں داخل تھا، لشکر ہی رہ گیا، اور کالج کمپاؤنڈ بورڈنگ میں ایک کمرہ لے لیا۔

کاکا صاحب کے باڑے (لشکر) میں مہاراجہ گوالیار کا دادیہالی خاندان رہتا ہے۔ اس کے بعض سرداروں سے میرے نیازمندانہ تعلقات تھے، گاہے ماہے سردار آنند راؤ صاحب

---

[1] ریاست گوالیار۔

سندھیا، سردار آپا صاحب سندھیا، اور سردار باپو صاحب سندھیا کے پاس آیا جایا کرتا تھا، ذرا گھڑی دو گھڑی کی دل لگی ہو جاتی تھی۔

جب کاکا صاحب کے باڑے کو جاتیں، تو سیدھے ہاتھ پر ایک گلی آتی ہے، بس اُسی گلی میں محمدی بُوا کا گھر بتایا جاتا تھا۔ اُدھر سے جاتے وقت کتنی ہی دفعہ مجھے محمدی بوا کی یاد آئی مگر یوں ہی کچھ خیال کر کر کے رہ رہ گیا۔

ایک مرتبہ، جب کہ چراغ جل چکے تھے، اُس طرف جاتے جاتے، یکایک خیال آیا، کہ لو بھئی آج تو ذرا بُوا کے پاس چلنا ہی چاہیے۔ انھیں دیکھے برسوں ہو گئے، نہ جانے بیچاری کیسی ہوں گی۔

گلی میں ایک صاحب ملے، میں نے اُن سے پوچھا، کیوں جناب یہاں میواتی بھی رہتے ہیں کیا؟

ہاں! رہتے تو ہیں، تمھیں کس کی تلاش ہے؟

یہاں تو محمدی بُوا گھٹی میں پڑا ہوا تھا، یہی منہ سے نکلا ذرا محمدی بُوا کے پاس جاؤں گا۔!

ارے! وہ صاحب تو ہکا بکا سے رہ گئے، میری صورت دیکھنے لگے، ہائیں! یہ کیا معاملہ ہے! شکل صورت رنگ ڈھنگ سے یہ شخص میواتی تو معلوم نہیں ہوتا، نہ کبھی آج تک ہم نے اسے اُن کے پاس آتے جاتے دیکھا، پھر یہ اُن کا رشتہ دار کہاں سے نکل آیا، جو "بُوا بُوا" کہتا ہے۔

پوچھنے لگے۔ وہ تمہاری کون ہیں؟

میں نے جواب دیا۔ جناب انھوں نے مجھے پالا ہے، وہ میری کھلائی ہیں، اُنھیں دیکھنے کو میرا جی چاہتا ہے، مہربانی کرکے ذرا محمدی بوا کا گھر بتا دیجئے۔

اچھا یہ بات ہے، ٹھیک، آیئے.....

پھر وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے، اونچی نیچی، ٹیڑھی سیدھی گلیوں میں سے لے جاکر انھوں نے مجھے ایک دروازے پر کھڑا کر دیا، اور کہا۔ یہ ہے ان کا گھر۔ اب جاؤں؟ السلام علیکم

وعلیکم السلام! آپ کی بڑی مہربانی ہوئی صاحب.....

وہ صاحب تو اتنا کہہ کر، یہ جا وہ جا۔ وہاں سے چلتے ہوئے

پھر میری جو حالت ہوئی کیا بتاؤں۔

گوالیار کے امیر امرا میں چھوٹے سے بڑا ہوا ہوں، وہاں کے راجہ رئیسوں سے میرے نیازمندانہ اور دوستانہ تعلقات ہیں دوسری ریاستوں کے درباروں میں بھی اکثر شرکت کا موقعہ ملا ہے، رئیسوں کے عالیشان محلوں میں مہمان رہا ہوں ایمان کی پوچھو، تو میں جانوں میرا خدا، کسی بڑے سے بڑے دربار کا مجھ پر ایسا رعب نہیں بیٹھا، جیسا اثر ایک غریب محتاج بیوہ محمدی بُوا کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ دیکھکر میرے دل پر ہوا آنکھوں میں تر بھرے پھرنے لگے، دماغ میں تیزی سے ایک فلم چلی، پچھلی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں دَم کے دَم میں میرے سامنے سے گذر گئیں اور میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

آخری دیدار

اُسوقت کا کیا حال کہوں، بُوا کو بُلانا چاہتا ہوں، اور جیسے کوئی گلا دبائے دیتا ہو، زبان نہیں کھلتی، آخر جی کڑا کر کے جیسے تیسے ایک آواز دی۔

"محمدی بوا"

کوئی جواب نہ آیا، اور معلوم ہوا جیسے جسم میں جان نہیں، سارا بدن سُن ہوگیا، سینے میں پنکھے لگے ہوئے ہیں، دل دھڑ دھڑ کر رہا ہے، کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہوش حواس درست کر کے میں نے ایک دم دو تین آوازیں لگائیں۔

محمدی بُوا! محمدی بُوا!! محمدی بوا!!!

کچھ دھیمی سی آواز آئی۔

اے کون ہے!

کلیجہ دھک سے رہ گیا، دل پر زور ڈال کر میں نے جواب دیا

میں ہوں..... فہیم..... میں فہیم ہوں..... بوا.....

میں فہیم ہوں.....

ہائیں! ارے فہیم! کیا فہیم ہے میرا..... آہا فہیم.....

آ میرا چاند..... اے میرے کلیجے کے ٹکڑے، صدقے گئی.....

آہا آج فہیم آیا.....

محمدی بُوا دوڑی دوڑی آئیں، اور دھاڑ سے چوپٹ کواڑ کھول دیئے، اِن کا ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد تھا، زیادہ سے زیادہ میری ہنسلی تک پہنچی ہونگی، دروازہ کھول، جیسے ہرن چوکڑی بھول جائے، ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

میں اُن کے سامنے، آنکھیں بند کیے، سناٹا کھینچے بُت بنا کھڑا تھا، نہ جانے کیا خیال آیا، اک دَم بوا مُجھ سے لپٹ گئیں، میں نے پَٹ سے آنکھیں کھول دیں، مگر چُپ، بوا نے بھی کتنی ہی دفعہ کچھ کہنا چاہا، زبان نہ کُھلی، کچھ یوں ہی مُنہ ہی منہ میں گُنگنا گُنگنا کر رہ گئیں، اسی حالت میں اُنھوں نے میرا ہاتھ اپنے منہ سے لگالیا، اُن کی آنکھوں سے ساوَن بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

میری مَسیں بھیگ رہی تھیں، چڑھتی جوانی تھی، میں اچھا خاصہ کرارا تھا، مگر میرا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا، بڑا زور لگایا، بہتیرا ضبط کیا، توبہ صاحب، دل کی سوتیں پھوٹ نکلیں، گرم گرم آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹنے لگیں، جی چاہتا تھا۔ یہ رونا کبھی بند نہ ہو۔

میں کسی گہرے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا، معلوم ہوا بڑے زور سے آندھی آرہی ہے، کچھ بھڑاس نکل کر بوا کا جی بھی کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا، بولیں، آلال! گھر میں چل۔ میں اُنکے ساتھ ہولیا۔

دالان میں مٹی کا دیا ٹمٹما رہا تھا، ایک ٹوٹی پھوٹی جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی، میری بُوا کا ایک ویران سا گھر تھا جیسا غریب غربا کا ہوا کرتا ہے۔

کڑوے تیل کے دیئے کی دھیمی دھیمی روشنی، وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں والا چہرہ، سبحان اللہ! کیسا اچھا لگتا تھا، محمدی بوا مجھے ایک پاک صاف محبت کی پتلی نظر آتی تھیں، واہ وا! ان میں میری بی آماں کی صورت جھلک رہی تھی، انھوں نے بڑے پیار سے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں آداب بجالا کر تھکے ماندوں کی طرح، ایک طرف ادب سے بیٹھ گیا۔

اب کہیں ذرا اُن کی زبان کھلی، چٹ چٹ بلائیں لیکر لگیں دعائیں دینے۔

لئے تیری ہزاری عمر ہو، تو جگ جگ جئے میرا لال! اچھا تو رہا؟

ائے میری آنکھوں میں خاک میں تو تیری صورت کو ترس گئی بیٹیا تیرے لئے پھڑکا کرتی ہوں، ہائے تو تو دائی بندی کو بالکل بھول ہی گیا، ائے ایسا بھی کیا، بیٹا! کبھی تو اس دکھیا کی آنکھیں ٹھنڈی کی ہوتیں،

دلوں کے بھید خدا ہی جانتا ہے، کہے نہیں جا سکتے، محمدی بوا مجھ سے لپٹی جاتی تھیں، شاید میں ابھی تک انھیں گود کا ہی نظر آرہا تھا، ان کا بس چلتا تو وہ سینہ چیر کر مجھے کلیجے میں بٹھا لیتیں، بے قرار ہو ہو کر، میرا ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگا لیتی تھیں اور بار بار میرے سر پر دست شفقت پھیرتی تھیں۔

شفیق بڑی بوڑھیاں برا نہ مانیں، سچ کہوں! بی اماں کے بعد میں نے سوائے محمدی بوا کے ویسی راحت کسی ہاتھ میں نہیں پائی بوا نے مجھے کھلونا بنا لیا، نہ جانے کتنی دیر تک میری صورت کا تماشا کرتی رہیں، اور میں دونوں جہان سے غافل رہا۔

آخر بڑی دیر بعد ڈرتے ڈرتے میں نے اجازت چاہی، اور وعدہ کیا کہ بوا انشاء اللہ پھر بھی حاضر ہونگا۔

اُن غریب کا اختیار رہوتا، تو ایک پل مجھے آنکھ اوجھل نہ ہونے دیتیں، کتنی ہی بار ٹالا، کتنی ہی دفعہ بہلایا، جب بالکل مجبور ہو گئیں تو کہنے لگیں۔

اچھا خیر! امیرالال! جیتا رہے، اللہ بیلی، جا خدا کو سونپا، اے دیکھ بھول نہ جائیو! ذرا جلدی سے یہ چاند سا مکھڑا دکھائیو!!

کتنی کتنی بار سلام کرنے، اور کئی کئی دفعہ بڑھنے تھمنے کے بعد جب میں بالکل ہی چلنے لگا، تو لو صاحب بوا بھی ساتھ ہو لیں، یا اللہ کیا کروں، سو سو منّتیں کیں، بوا آرام کرو! میں چلا جاؤں گا، آداب بجالاتا ہوں، لیکن اُن کا دل کہاں مانتا تھا۔ مامتا مجبور کر رہی تھی۔

کہنے لگیں چندا! نئی نئی جگہ ہے، واری جاؤں رات کے وقت، رستہ بھول جائے گا، پھر میں کیا کرتا، عاجز ہو گیا، بہتیرا رِرِیاتا[1] ہوں بوا نہیں مانتیں، سائے کی طرح ساتھ ساتھ آرہی ہیں، سخت پریشان تھا کیا کروں، یہ تو مامتا میں دیوانی ہو رہی

---

[1] گھگھیانا، منت کرنا۔

ہیں، کہیں راستے والے تماشہ نہ کرلیں۔

بڑی مشکلوں سے میری مادر مجازی محمدی بُوا، میری بلائیں لے کر مجھے دعائیں دیتی پلٹیں، اور بیچاری قدم قدم پر مُڑ مُڑ کر دیکھتی جاتی تھیں۔

وہ رات اور آج کی گھڑی، بُوا پھر نہ ملیں، نہ جیتے جی ملنے کی کوئی اُمید ہی رہی۔

جنھوں نے مجھے گودیوں کھلایا تھا، وہ کفن اوڑھے میٹھی نیند پڑی سو رہی ہیں۔

الٰہی! اُنھیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب ہو، اُن کی گور جنّت کے پھولوں سے بھری رہے۔

آمین۔

مرزا فہیم بیگ۔ مہیم چغتائی

بچوں کی کتابیں

منتخب الحکایات	۸ر	آویزہ گوش	۸ر
چند پند	۸ر	شہزادی گلنار	۱۴ر
نصیحت کا کرن پھول	۸ر	شیدلا	۱۳ر
غنچہ حکمت	۱۴ر	مرغی اجمیر چلی	۲ر
قیدی شیر	۱۴ر	نیت کا پھل	۲ر
باز بچہ	۱۴ر	بیکاری	۲ر
نعیم بچیسی	۱۳ر	تانبیل خان	۲ر
دامن مریم	۸ر	بچوں کی کہانیاں	۲ر

آٹھ کتابوں کا سٹ

(۱) دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ ..... از حکیم ناصر نذیر فراق۔ قیمت ۱۴ر

(۲) بیگموں کی چھیڑ چھاڑ ..... " " " ۱۴ر

(۳) سات طلاقوں کی کہانیاں ..... " " " ۱۴ر

(۴) خواب پریشاں ..... از مولوی عنایت اللہ بی اے ۱۴ر

(۵) عشق کی گولیاں ..... مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۴ر

(۶) تماشا بہ تماشہ ..... از ناکارہ حیدر آبادی ۱۴ر

(۷) گمنام عورت کا خط ..... از ظفر۔ قریشی بی اے ۱۴ر

(۸) انکشاف حقیقت ..... از صادق الخیری بی اے۔ ۱۴ر

ملنے کا پتہ } ہندوستانی کتبخانہ اردو بازار جامع مسجد دہلی

[م جھرل]

مطبوعہ تجلی برقی پریس دہلی